ڈاکٹر محمود الحسن عارف

اراضی پاک و ہند کی شرعی حیثیت

—— یہ مقالہ مارچ ۸۸ء میں منعقدہ سالانہ محاضراتِ قرآنی میں پڑھا گیا ——

جناب صدر گرامی! محترم امیر تنظیم اسلامی، معزز رفقائے تنظیم اسلامی و دیگر قابل قدر حاضرین کرام۔

"محاضرات قرآنیہ" کے سلسلے کی اس علمی و فکری نشست میں راقم الحروف اپنی اس حاضری کو باعث سعادت تصور کرتا ہے اور محترم امیر تنظیم اسلامی اور ان کے جواں ہمت رفقائے کار کی خدمت میں قرآنی علوم وافکار کو عام کرنے کی اس فیاضانہ کاوش پر پر خلوص ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے۔ خداتعالیٰ امت مسلمہ کو فکر قرآنی کو جاننے، ماننے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

"اسلامی معاشیات" کی اس فکری نشست کے لئے میرے مقالے کا عنوان "اراضی برعظیم پاک و ہند کی شرعی حیثیت، قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی کے فتاویٰ کی روشنی میں" ہے، لیکن اپنے اس موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں "قاضی صاحب" قدس سرہ کے علمی و فکری مقام کی طرف چند اشارات کرتا چلوں، تاکہ ان کے حوالے سے جو بات کی جائے سامعین کو اس کی قدر و منزلت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

قاضی صاحب مغلیہ سلطنت کے دور زوال اور محمد شاہ کے عہد حکومت میں نواح ۱۱۴۰ھ/۲۸-۱۷۲۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں وفات پائی، وہ پدری رشتے سے ۳۲ واسطوں کے ساتھ حضرت عثمانؓ کی اور مادری سلسلے سے چالیس پشتوں کے ساتھ میزبان نبوی حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد ہیں۔ پانی پت میں ان کا خاندان ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں ایران کے راستے سے خواجہ عبدالرحمٰن گاذرونی کے توسط

سے پہنچا۔ یہاں اس خاندان نے علمی وفکری طور پر بہت ترقی کی۔ ان کے جدّی سلسلے کو مخدوم شیخ جلال الدین کبیر الاولیا عثمانی، چشتی کی وجہ سے اور مادری خاندان کو شیخ عبداللہ انصاری المعروف بہ پیر ہرات یا پیر ترکستان کے باعث خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ قاضی صاحب کے اپنے بیان کے مطابق ان کے اس خاندان میں قریب قریب دس پشتوں سے علم کا سلسلہ متوارث چلا آتا ہے، جبکہ ان کی تین پشتوں سے پانی پت کی "قضا" کا شعبہ ان کے خاندان سے متعلق تھا، قاضی صاحب کے نانا نواب لطف اللہ خاں صادق بہادر تہور جنگ، دربار مغلیہ کے شش ہزاری منصب دار تھے اور ان کے ماموں نواب شاکر خاں مغلیہ حکمران "شاہ عالم" کے دیوان اور خصوصی معتمد علیہ تھے۔

قاضی صاحب علمی وفکری دنیا میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس صدی کے بہترین علماء وفضلاء سے علم حاصل کیا، ان کے اساتذہ کی فہرست میں قاری محمد صالح المصری تلمیذ شیخ عبدالخالق المنوفی، شیخ محمد فاخر محدث الہ بادی تلمیذ شیخ محمد حیات السندی، شیخ مرزا مظہر جان جاناں دہلوی تلمیذ شیخ محمد افضل محدث سیالکوٹی اور امام العصر شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی جیسے اکابر علم شامل ہیں، مؤخر الذکر یعنی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے انہیں خصوصی شرفِ تلمّذ حاصل تھا، شاہ صاحب کے تمام شاگردوں میں شاید ہی کوئی ایسا شاگرد ہو جو اپنی تصانیف، علمی وفکری تحقیقات اور خاص طور پر فقہ واجتہاد میں ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہو۔ ان کے علم وفضل کا یہ عالم تھا کہ شاہ عبدالعزیز سا بالغ نظر محدث ان کو "بیہقی وقت" اور مرزا مظہر سا شیخ کامل "عَلَم الہدای" (نشان ہدایت) کے القاب سے یاد کرتے تھے۔ انہیں مرزا مظہر سے یہ منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ اگر روز قیامت اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ پوچھیں گے کہ میں اسکی بارگاہ میں کیا تحفہ لے کر آیا ہوں تو میں قاضی صاحب کو بارگاہ خداوندی میں پیش کروں گا۔

انہوں نے مختلف موضوعات پر ۳۶ کے قریب کتابیں تصنیف فرمائیں، جن میں ان کی عربی تفسیر تفسیر مظہری سب سے نمایاں ہے۔ یہ تفسیر بہت سے امتیازی اوصاف کی حامل ہے، اور یہ بلاشبہ ہندوستان بھر میں تصنیف کی جانے والی پہلی مکمل عربی تفسیر ہے۔ اور یہ ہندو پاک کے علماء کی ان کاوشوں میں سے ایک ہے، جسے ہندو پاک بجا طور پر عرب دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔

اس عظیم تفسیر کے مؤلف نصف صدی کے قریب پانی پت کے قاضی وجج بھی رہے۔ اپنی اس حیثیت میں انہیں فقہ اور مسائل فقہ کے مطالعے اور اس کے نفاذ دونوں کے مشاہدے کا موقع ملا۔ بعض اوقات دربار شاہی کے فیصلے بھی ان کی فقہی رائے پر موقوف رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہر مکتب فکر کے ہاں ان کا یکساں ادب واحترام کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اراضی برعظیم پاک وہند کے بارے میں ان کی رائے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اراضی ہند کا تاریخی پس منظر

اراضی ہندوپاک پر شرعی حیثیت سے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اس کے تاریخی پس منظر پر کچھ روشنی ڈالوں۔ فقہی اعتبار سے مسلمانوں کی مفتوحہ اراضی کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ قسم اول میں وہ اراضی آتی ہیں جو مسلمانوں نے صلح ومعاہدہ کے ذریعے حاصل کیں، مثلاً نجران 'ایلا' اذرج وغیرہ کے علاقے اس قسم کی زمینوں کے معاملے میں معاہدات ہی پر عمل کیا جاتا ہے جبکہ قسم ثانی میں ایسے علاقے شامل ہیں جنہیں مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کیا اور وہاں اسلامی حکومت قائم کی۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی بیشتر زمینیں اسی قسم میں شامل ہیں ۔ آج کی اس نشست میں یہی قسم ہماری اس بحث وتمحیص کا موضوع ہے۔

سیاسی وجغرافیائی مجبوریوں کے تحت مسلمانوں نے برعظیم پاک وہند کی سرزمین کو کئی قسطوں میں فتح کیا۔ اس "فتح مبین" کی ابتدا نوجوان جرنیل اور فاتح محمد بن قاسم نے ۹۳ھ/۷۱۲ء میں حملۂ سندھ سے کی، اس نوجوان فاتح نے نہ صرف راجہ داہر کو اس کی مسلسل پیمان شکنیوں کی سزا دی بلکہ دیبل (نواح کراچی) سے لے کر ملتان تک کا علاقہ (بشمول بلوچستان) فتح کر کے اسلامی قلمرو میں شامل کر لیا۔ محمد بن قاسم کشمیر اور شمالی ہند پر اپنے حملے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے کہ دربار خلافت کی طرف سے ان کی معزولی کے فرمان نے ہندوپاک کے بقیہ خطوں کو مسلمانوں کے قدوم میمنت سے کچھ عرصے کے لئے محروم کر دیا۔

فتوحات اسلامیہ کا اگلا باب سلطان محمود غزنوی (۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء) نے اپنے سترہ

حملوں کے ذریعے تصنیف کیا۔ مسلمانوں نے نہ صرف ہندو راجوں اور مہاراجوں کی فوجی قوت کا خاتمہ کیا بلکہ موجودہ پاکستان میں شامل جنوبی پنجاب و سرحد کے بیشتر علاقوں کو فتح کر کے سلطنت غزنویہ کا حصہ بنا دیا۔ سلطان محمود غزنوی کے مشن کی تکمیل سلطان شہاب الدین محمد غوری اور اس کے بہادر سپہ سالار و جانشین سلطان قطب الدین ایبک کے ہاتھوں سے ہوئی۔ جنہوں نے دہلی اور اس کے آگے تک کے علاقوں کو فتح کر کے " سلطنت دہلی " قائم کی۔ اسی زمانے میں ایبک کے جرنیل محمد بن بختیار خلجی نے عزم و جواں ہمتی کی ایک داستان تصنیف کر کے بنگال، بہار اور ہماچل پردیش وغیرہ کے دروازے مسلم افواج کے لئے کھول دیئے، جبکہ جنوبی ہند اور دکن کو سلطان علاؤالدین خلجی (م۷۱۵ھ/۱۳۱۶ء) کے حکم پر اس کے سپہ سالار ملک کافور نے فتح کر کے اسلامی قلمرو میں شامل کیا۔ یوں چھ صدیاں پہلے کا " فتح ہند " کا مشن مجموعی طور پر اختتام کو پہنچا، گو جزوی طور پر یافت اور بازیافت کا سلسلہ اورنگ زیب عالمگیر (م۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) کی وفات تک جاری و ساری رہا

اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ برعظیم پاک و ہند کی اس سرزمین کو مسلمانوں نے بڑی طویل جدوجہد اور کئی خونریز جنگوں کے بعد حاصل کیا، اس کے حصول کے لئے بلا مبالغہ ہزاروں مسلمانوں نے جان و مال اور عزت و ناموس کی قربانیاں پیش کیں، اس بنا پر یہ سرزمین فتوحات اسلامیہ کی قسم ثانی ہی کے زمرے میں آتی ہے، جس پر بلاشبہ" فتح الامام بلدۃ عنوۃ ای قھرًا " (امام کا کسی علاقے کو بزور شمشیر فتح کرنے کا) عنوان ہی صادق آتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے اس " قسم ثانی " کے لئے کیا احکام تجویز کئے ہیں۔

کتب تاریخ مثلاً البلاذری کی فتوح البلدان، ابن الاثیر کی تاریخ الکامل، قاضی ناصر کی طبقات ناصری اور محمد بن قاسم فرشتہ کی تاریخ فرشتہ وغیرہ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان تمام مفتوحہ علاقوں پر مسلم فاتحین نے " خراج " ہی مقرر کیا تھا۔ اسطرح یہ تمام زمینیں " سواد عراق " (عراقی سرزمین) ہی کے طبقے میں شامل سمجھی جاتی ہیں۔

" عراق " کی سرزمین، جو بعد کے مفتوحہ علاقوں کے لئے ایک نظیر اور بنیاد ثابت ہوئی " عہد فاروقی " میں فتح کی گئی۔ فتح کے بعد اس کی تقسیم پر صحابہ کرام کے درمیان اختلاف پیدا

ہو گیا۔ بعض صحابہ کرام یہ چاہتے تھے کہ اس تمام مفتوحہ علاقے کو "مجاہدین" کے مابین اسی طرح تقسیم کر دیا جائے، جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خیبر کی مفتوحہ زمینوں کو صحابہ کرام کے درمیان تقسیم فرمایا تھا، لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد فرمایا کہ اگر تمام مفتوحہ زمینیں موجودہ مجاہدین میں تقسیم کر دی گئیں تو آئندہ دور کے مسلمانوں کی ضروریات کی کفالت کیوں کر ہو سکے گی۔ اور پھر حضرت فاروق اعظم یہ بھی مشاہدہ فرما رہے تھے کہ اگر زمینوں کی تقسیم کا یہ عمل اسی طرح جاری رہا تو ایک طرف تو صحابہ کرام کے بڑھتے ہوئے قدم زمینداری کے خارزار میں الجھ کر رہ جائیں گے اور دوسری طرف خود مسلمانوں میں بڑے بڑے زمیندار پیدا ہو جائیں گے اور یوں دولت اور وسائل کے ارتکاز کی وہ صورت حال پیدا ہو جائے گی جس سے قرآن مجید میں صراحۃً روکا گیا ہے۔

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں اس اختلاف اور پھر اجماع کی روداد ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

"فتح عراق کے وقت عہد فاروقی میں مسلمانوں کے درمیان (زمینوں کی تقسیم کے مسئلے پر) اختلاف پیدا ہو گیا۔ امام ابو یوسف اپنی کتاب الخراج میں یہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے بہت سے علماء مدینہ نے یہ بیان کیا کہ جب حضرت عمر فاروقؓ کے پاس حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی طرف سے فتح عراق کا مژدہ لے کر وفد پہنچا تو حضرت عمر فاروق نے اراضی عراق و شام کے بارے میں مشورہ کیا۔ اس سلسلے میں کچھ لوگوں نے حضرت عمر فاروقؓ سے کہا کہ وہ اراضی ان کا حق ہیں فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ اگر ساری اراضی مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تو پھر بعد کے آنے والے مسلمانوں کا کیا ہو گا............ اگر میں عراق و شام کی تمام زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دوں تو سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا۔ نیز اولاد اور اس علاقے کے لوگوں کے لئے کیا بچے گا۔ جبکہ اہل عراق و شام حضرت عمر سے با اصرار یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ حضرت عمر اس زمین کو ایسی قوم کی کفالت کے لئے وقف کر دیں جو کہ ان جنگوں میں شامل نہیں، اور مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے لئے، حضرت عمرؓ کی اس رائے پر مہاجرین تو متفق ہو گئے مگر انصار متفق نہ ہوئے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ۵ صحابہ اوس سے اور پانچ خزرج سے طلب کئے۔ اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ انہوں نے اس فیصلے سے اتفاق کر لیا"۔

ارض عراق کے بارے میں حضرت فاروق اعظم کے اس حکم کو امام ابو عبید القاسم بن سلام نے یوں نقل کیا ہے:

"یہ زمینیں مسلمانوں کے لئے محفوظ بطور وقف رکھی جائیں کہ نسلاً بعد نسلٍ ان کا فائدہ پہنچتا رہے۔ اور ان کے لئے اپنے دشمن کے مقابلے میں تقویت کا باعث ہوں"۔

حضرت فاروق اعظم کا یہ حکم نامہ فقہا کے مابین بھی اختلاف و نزاع کا باعث بنا' چنانچہ امام ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ وہ اگر چاہے تو مفتوحہ زمینوں کو مجاہدین (غانمین) میں تقسیم کر دے جیساکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کو تقسیم فرمایا' اور چاہے تو وہ زمین اس کے قدیم مالکوں کے قبضے میں رہنے دے اور خود کفار پر جزیہ اور زمینوں پر خراج مقرر کر دے۔ جیساکہ حضرت عمر فاروق نے صحابہ کرام کے اتفاق کے ساتھ "ارض عراق" کے بارے میں یہی حکم نافذ فرمایا ۔ بعض قدیم مصادر میں حنفی مسلک کے بیان کے لئے "وقف" کی اصطلاح بھی ملتی ہے۔" جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان سے حاصل شدہ منافع تمام مسلمانوں پر تقسیم ہوں گے' امام مالک اور امام احمد بن حنبل نے بھی اس دوسری صورت کو ترجیح دی ہے' البتہ امام شافعی اسے مجاہدین میں تقسیم کرنے کی حمایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مفتوحہ زمینیں مجاہدین کی رضامندی کے بغیر وقف نہیں کی جاسکتیں ۔ لیکن بقول امام شوکانی جمہور صحابہ و تابعینؒ اور خلفائے راشدین کی آراء حنفی و مالکی مسلک کی تائید کرتی ہیں

برعظیم پاک و ہند کی تمام زمینیں چونکہ بزور شمشیر فتح کی گئی ہیں اسی لئے اس پر قریب قریب تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ یہ تمام زمینیں خراجی ہیں۔ عشری نہیں ہیں۔ اور یہ کہ خراجی زمینوں کا خراج تمام مسلمانوں کی بہبود و کفالت عامہ کی مد میں خرچ کیا جاسکتا ہے' ہندوستان کے علماء و فقہانے خاص اس مسئلے کی تحقیق و تدقیق کے لئے بڑی بڑی کاوشیں کی ہیں۔ ہندوستان کے تمام فتاویٰ میں یہ مضمون تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ فتاویٰ کے علاوہ اس عنوان پر مستقل کتابوں کی بھی کمی نہیں۔ ہندوستان کے ایک جلیل القدر عالم مولانا جلال الدین تھانیسری (م ۹۸۹ھ/ ۱۵۸۱ء) نے عربی زبان میں ایک مستقل

رسالہ "تحقیق اراضی ہند" تصنیف فرمایا جو ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵ء میں مطبع احمدی میں طبع ہو چکا ہے اور اس کے قلمی نسخے جامعہ پنجاب لائبریری سمیت مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس وقیع علمی رسالے میں شیخ جلال الدین تھانیسری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بیشتر زمینیں ان لوگوں کی ملک نہیں ہیں جن پر وہ قابض ہیں بلکہ ان میں سے اکثر زمینیں سرکاری خزانے کی مملوکہ ہیں اور حکومت اسلامیہ مفاد عامہ کے لئے ان میں جائز تصرف کرنے کی مجاز ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

"پس نتیجہ یہ نکلا کہ امام ابو حنیفہ کے قول پر ہندوستان کی اکثر و بیشتر اراضی ان لوگوں کی ملکیت نہیں ہیں جو ان پر قابض ہیں۔ سوچو اور سمجھو پھر معلوم رہے کہ جب ہندوستان کی اراضی ان انواع مختلفہ پر قائم ہیں جن کا گذشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے تو اراضی ہند کے متعلق کسی شخص کی ملکیت و عدم ملکیت پر حکم لگانا اس وقت تک درست نہیں ہے جب تک یقین کے ساتھ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ ذکر کردہ انواع میں سے کس نوع میں شامل ہے"۔

شیخ جلال الدین تھانیسری کے یہ فقہی ارشادات اس زمانہ سے متعلق ہیں جب ہندوستان پر مسلم حکومت کا آفتاب عین نصف النہار پر تھا۔ اور ہندوستان کے طول و عرض میں مغل اعظم کے اقتدار کی بساط بچھی ہوئی تھی جبکہ متاخر مغلیہ عہد کے مشہور و معروف محقق قاضی محمد اعلیٰ التھانوی (م ۱۱۹۱ھ/ ۱۷۷۷ء) مؤلف کشاف اصطلاحات الفنون نے بھی خاص اسی موضوع پر ایک رسالہ تصنیف فرمایا' جو تاہنوز زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکا اس رسالے میں قاضی التھانوی نے شیخ جلال کے مسلک کی تائید کی' اور اسی کو راجع قرار دیا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری اس کی بابت فرماتے ہیں:

"مولانا محمد اعلیٰ تھانوی نے اپنے رسالے میں ذکر کیا ہے کہ اراضی ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی بلکہ اراضی حوزہ یعنی سرکاری بیت المال کی ملکیت ہیں' کسی کی شخصی ملکیت نہیں"۔

قاضی محمد اعلیٰ تھانوی قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی کے ہم عصر ہیں۔ مگر معاصرت کے باوجود دونوں کی آراء میں ہمیں معمولی سا اختلاف نظر آتا ہے۔ جس کی تفصیل سطور ذیل میں پیش کی

جائے گی۔

قاضی محمد ثناءاللہ پانی پتی نے اس عنوان پر گو مستقل رسالہ یا کتاب تو تصنیف نہیں کی تاہم انہوں نے اس کے متعلق فتاویٰ ضرور تحریر کئے ہیں جن میں سے دو فتاویٰ دستیاب ہیں جن میں اس موضوع پر مفصل اظہار خیال کیا گیا ہے۔

قاضی صاحب کے ان فتوں کا شان ورود یہ ہے کہ مسلم حکمرانوں کی طرف سے مختلف امراء اور خاندانوں کو "مدد معاش" کے لئے جو زمینیں دی جاتی تھیں قاضی صاحب کے زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا یہ زمینیں ان لوگوں کی شرعی ملکیت ہیں یا یہ ملکیت محض عارضی اور وقتی نوعیت کی ہے۔ اس مسئلے میں کاندھلہ کے ایک مشہور عالم دین مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (م ۱۲۴۵ھ / ۱۷۲۹ء) کے پاس قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کا فتویٰ موجود تھا۔ اس فتوے پر اظہار خیال اور تبصرہ کے لئے مفتی صاحب نے اسے قاضی محمد ثناءاللہ پانی پتی کی خدمت میں ارسال کیا، ٹھیک طور پر تو معلوم نہ ہو سکا کہ قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کے فتویٰ کی اصل عبارت کیا تھی۔ لیکن قاضی محمد ثناءاللہ پانی پتی کی عبارت کے بین السطور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس میں چند اختلافی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔ قاضی صاحب اس فتوے پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"بعد سلام مسنون کے بعد واضح ہو کہ آپ کا پہلا خط مع استفتاء ملا تھا، اس کے ساتھ قاضی محمد اعلیٰ کی مہر لگا ہوا وہ حکم نامہ بھی تھا جو مدد معاش کے بارے میں بادشاہ کے دستور العمل کی مطابقت پر قاضی کے حکم کے بارہ میں تھا......... اس بارے میں فتویٰ تحریر کیا جاتا ہے۔

> "سواد عراق کی زمینوں کی طرح ہندوستان کی زمینیں بھی نہ مسلمان بادشاہوں کی ملکیت ہیں اور نہ مسلمانوں کی بلکہ ان کے مالک زمین والے ہی ہوں گے، خواہ کافر کیوں نہ ہوں، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں سواد کی زمین زمین والوں کی ہوگی، ان لوگوں کو اسے بیچنے اور اسمیں تصرف کرنے کا حق حاصل رہے گا۔ کیوں کہ امام جب کسی زمین کو زبردستی فتح کرے تو وہ اس پر زمین والے کے قبضے کو برقرار رکھے گا اور اس پر خراج عائد کرے گا۔ اسطرح زمین (پہلے کی طرح) اپنے مالک کی ملکیت اور تصرف میں رہے گی"۔

زمین پر خراج ایک اسلامی حق ہے ' بادشاہ اس کو لینے اور اس کے مصرف میں خرچ کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے اگر وہ بیجا مصرف میں خرچ کرے گا تو وہ گنہ گار ہو گا قاضی صاحب کا یہ زمانہ ایک عبوری دور سمجھا جاسکتا ہے جس میں ملکی اور قومی سطح پر تبدیلیوں کا عمل بڑی تیزی کے ساتھ جاری تھا۔ مغل انتظامیہ کمزور سے کمزور ہورہی تھی اور دوسری جانب مختلف صوبوں کے گورنر اپنی اپنی جگہ خود مختار ہو رہے تھے۔ اگر مزید گہرائی میں جاکر سوچا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ برعظیم پاک وہند میں بڑی بڑی جاگیروں اور جائیدادوں کے قیام واستحکام کا یہی زمانہ تھا۔ لہٰذا اسے وقت کا اہم ترین مسئلہ یعنی BURNING QUESTION بھی کہا جاسکتا ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے اس فتوے میں اسی صورت حال کو پیش نظر رکھا ہے۔ قاضی صاحب کا یہ فتویٰ مفصّل ہے اسمیں حسب ذیل امور پر روشنی ڈالی گئی ہے:

۱...... اگر بنجر زمین کا کوئی قطعہ بادشاہ اسلام کسی شخص کو عطا کر دے اور وہ اس بنجر زمین کو آباد کر لے تو وہ اس کا جائز مالک ہو گا اور حکومت وقت اس سے عشر یا خراج وصول کر کے اس کے جائز مصرف میں خرچ کرنے کی ذمہ دار ہو گی۔

۲...... اگر زمین سرکاری بیت المال کی ہے جسے "ارض حوزہ" کہا جاتا ہے اور بادشاہ وقت اس میں سے کسی شخص کو کوئی قطعہ مرحمت کر دے تو وہ اس کا شرعی مالک متصوّر ہو گا۔

۳...... ان دو اقسام کے علاوہ قاضی صاحب کے نزدیک ہندوپاک کی بیشتر اراضی "خراجیہ" ہے یعنی نہ وہ بادشاہ اسلام کی ملکیت ہے اور نہ مسلمانوں کی 'بلکہ وہ اراضی اصل قدیمی باشندوں کی ملکیت ہے۔ اسلامی حکومت ان کا خراج وصول کرنے اور اسے کفالت عامہ کی مد میں صرف کرنے کی مجاز ہو گی۔

۴...... اگر وہ اراضی مقامی کسانوں کی ملکیت ہو اور بادشاہ وقت نے کسی شخص کو محض اس زمین کا محصول (لگان) وصول کرنے کا حق دیدیا ہو تو ایسی صورت میں وہ شخص متعلقہ زمین کا مالک نہ ہو گا۔ بلکہ محض اس کے محصول کو وصول کرنے کا حقدار ہو گا۔

۵...... اسی طرح اگر بادشاہ "مدد معاش" کے لئے کسی شخص کو مزروعہ زمین کا خراج وصول کرنے کے اختیارات سونپ دے جیسا کہ ہندوستان کے عام بادشاہوں کا دستور ہے تو ایسی صورت میں وہ شخص محض خراج وصول کرنے کا اہل ہو گا وہ نہ اس خراج کو بیچ سکتا ہے اور

نہ کسی کو بطور عطیہ اور ھبہ کے عطا کر سکتا ہے۔ فتاوی احمدیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ :

"جن زمینوں کو امام استحقاق کے طور پر کسی شخص کو دیتا ہے تو یہ شخص ان زمینوں کا مالک نہیں ہوتا ہے اس وجہ سے نہ انکو بیچا جا سکتا ہے اور نہ ھبہ کیا جائے گا۔ اور نہ انہیں وراثت چلے گی بلکہ عطا کئے جانے والے شخص کی وفات کے بعد خراج بیت المال میں داخل کر لیا جائے گا"۔

۶..... قاضی محمد اعلیٰ التھانوی کے نزدیک پرانے بادشاہوں کا دستور العمل ان کے بعد بھی جاری رکھا جا سکتا ہے اور اس ضمن میں قاضی کے فیصلے کو "حکم حاکم" ہی کی حیثیت حاصل ہوگی مگر قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو قاضی محمد اعلیٰ کی اس رائے سے اتفاق نہیں' ان کے خیال میں "مدد معاش" کے تحت دی جانے والی زمینوں کے بارے میں بادشاہ کی زندگی تک ہی محدود رہے گا۔ اس کی وفات کے بعد اسے جاری نہیں رکھا جا سکتا' جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر بادشاہ سابق نے کسی شخص کو خراجی زمینوں میں سے کوئی جاگیر دی ہو تو وہ چونکہ ملک کی زمینوں کا مالک نہیں ہے بلکہ منتظم ہے لہٰذا ملکی اراضی کسی خاندان کی مستقل ملکیت میں دینا اس کے اختیارات سے تجاوز ہے اور اس عطیئے پر نظر ثانی کا حق مملکت کو بہر حال رہتا ہے۔

یہاں شیخ جلال الدین تھانیسری اور قاضی صاحب کے نقطہ نگاہ کا فرق محسوس کیا جا سکتا ہے شیخ جلال الدین کے نزدیک اگر بادشاہ وقت خراجی زمین کسی کو بطور جاگیر عطا کر دے تو وہ سابقہ مالکان کی ملک سے خارج ہو کر اس کی ملک میں داخل ہو جائے گی۔ مگر قاضی صاحب کے نزدیک بادشاہ وقت کو اس قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں' ہندو پاک کی اراضی مملکت کی اراضی ہیں بادشاہ زیادہ سے زیادہ کسی کو مدد معاش کے لئے اس کا لگان وصول کرنے کا اختیار دے سکتا ہے اور وہ بھی عارضی اور محدود مدت کے لئے۔یوں اراضی "ہندو پاک" اصل مالکان کی ملک میں رہتے ہوئے مملکت یعنی سٹیٹ کی ملکیت ہوں گی۔

قاضی محمد اعلیٰ التھانوی کا یہ بھی خیال تھا کہ صدر الصدور گویا قاضی شہر کو بحیثیت نائب سلطان جاگیروں کو بحال رکھنے یا منسوخ کرنے کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مگر قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی اس نکتے سے اختلاف کرتے ہیں اور واضح فرماتے ہیں کہ قاضی کو

محض حکم شرعی کے مطابق یا "بادشاہ حال" کے دستور العمل کے مطابق ہی فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سے تجاوز کرنے کا نہیں' قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"لیکن یہ واضح رہے کہ یہ حکم موجودہ بادشاہ سے متعلق ہے کیوں کہ اگر بادشاہ کا انتقال ہو جائے یا وہ معزول کر دیا جائے تو اس کا حکم معتبر نہ ہو گا۔ خلاصہ کلام یہ کہ بادشاہ اپنی سلطنت کے تمام شہروں میں نہیں پہنچ سکتے تھے اس لئے وہ صدور کو مقرر کرتے اور اپنا دستور العمل تحریر کرتے تھے' اسی کے مطابق انعام پانے والے کے ورثہ معاشی مدد کے لئے دی جانے والی زمینوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ یہ دستور العمل بادشاہ کی زندگی تک جاری و معتبر سمجھا جاتا ہے۔ صدور اسی پر عمل کرتے ہیں اور قضاہ بھی صدور کے حکم کو جاری کرتے ہیں کیوں کہ وہ بادشاہ کے نائب ہوتے ہیں لیکن بادشاہ کی موت کے بعد وہ دستور العمل معتبر نہیں رہ جاتا۔"

انگریزوں کی عطا کردہ اراضی کا حکم

قاضی صاحب نے مذکورہ دونوں فتاوی ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء میں تحریر فرمائے اس وقت دھلی اور پانی پت پر ابھی انگریز حکومت کی عملداری قائم نہ ہوئی تھی' انگریزوں نے دھلی اور تمام دو آبہ پر لارڈ لیک کی قیادت میں ۱۲۱۸ھ/ ۱۸۰۳ء میں قبضہ کیا اسی لئے ان فتاوٰی میں برطانوی استعمار کی عطا کردہ اراضی کا مسئلہ زیر بحث نہیں لایا جا سکا اور نہ ہی قبل از وقت ایسا ممکن تھا' تاہم قاضی صاحب نے بطور اصول اور ضابطے کے چند ایسے نکات بیان کئے ہیں کہ جن سے اس اہم مسئلے میں بھی رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے ایک اصول تو یہ ہے کہ کسی بھی بادشاہ وقت کو مملکت اسلامیہ کا کوئی بھی قطعہ اراضی (باستثنائے چند) کسی کی مستقل ملکیت میں دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ وہ مدد معاش کے طور پر کسی علاقے کا خراج وصول کرنے کا اختیار کسی کو تفویض کر سکتا ہے۔ مگر یہ اختیار بھی خالصتاً عارضی بنیادوں پر اسے حاصل رہے گا۔ جبکہ دوسرا اصول یہ ہے کہ "مدد معاش" کی آگے منتقلی محض بادشاہ وقت کے دستور العمل کے مطابق ہو سکتی ہے۔ اب آیئے ہم دیکھیں کہ برطانوی استعمار نے برعظیم پاک وہند کی یہ سرزمین کس طرح حاصل کی اس سلسلے میں محتاط سے محتاط بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ انگریزوں نے جنگ بکسر (۱۱۷۹ھ/ ۱۷۶۵ء) کے ایک سال بعد مغل

بادشاہ شاہ عالم سے بنگال کے حقوق دیوانی دو لاکھ روپے میں حاصل کر لئے تھے۔ اور بعد ازاں وہ مکر و فریب کی سیاست کے ذریعے مغلیہ حکومت کے وکیل مطلق بنے 'اور پھر انہوں نے بادشاہ ہند کو اپنا وظیفہ خوار بنا لیا۔ اس طرح ہندوستان پر انگریز راج دھوکے اور شاطرانہ چالبازی کے بل بوتے پر قائم ہوا۔ ایسی صورت میں اس کو کسی قسم کی شرعی اور قانونی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے تمام علماء و فقہا نے انگریز حکومت کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا اور انگریز حکومت کے دو صدیوں پر محیط دور حکومت میں ہمیشہ مسلمانوں نے اس کے خلاف علم جہاد بلند رکھا۔ اس پس منظر میں انگریز حکومت کی جانب سے جن لوگوں کو ابنائے وطن سے غداری کے نتیجے میں سیکڑوں کے حساب سے مربع الاٹ کئے گئے گو مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم و مغفور نے ان کے جائز ہونے کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ مگر قاضی صاحب کے مذکورہ بالا اصولوں کے تحت اس کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ تاہم قانون رواج کے تحت ان کو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ قاضی صاحب نے ہندو پاک کی اراضی کے بارے میں جو نقطہ نظر پیش کیا۔ سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدّث دھلوی (م ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) اور شاہ اسماعیل شہید (م ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) کے فتاویٰ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

اختتام

اسلامی معاشی نظام محض "سود" کا نام بدل دینے یا ہر سہ ماہی کے بعد سو دو سو روپیہ فی خاندان زکوٰۃ تقسیم کرنے سے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بجائے اسلامی معاشیات کی منزل مراد کفالت عامہ کا تصور ہے جسے قرآن مجید نے وَ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ یعنی لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کونسا مال خرچ کریں کہہ دو جو ضرورت سے زیادہ ہو اور وَ فِیْ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ یعنی اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے دونوں کا حق ہوتا ہے وغیرہ کی آیات طیبہ کے ذریعے سے پیش کیا "کفالت عامہ" سے مراد یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے ہر شہری کو رہنے کے لئے مکان 'کھانے کے لئے روٹی اور پہننے کے لئے موسم کے مطابق لباس ملنا چاہئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ روٹی کپڑے اور مکان کا یہ نعرہ سوشلزم نے دیا حالانکہ یہ پروگرام سب

سے پہلے اسلام نے پیش کیا تھا۔ علامہ ابن حزم (م ۴۵۶ھ/ ۱۰۶۴ء) اپنی کتاب المحلی میں تحریر فرماتے ہیں:

فرض على الاغنياء من اهل كل بلد ان يقوموا بفقرائهم ويجبر هم السلطان على ذالك ان لم تقم الزكوات بهم ولا فى سائر اموال المسلمين بهم فيقام لهم بما يأكلون من القوت الذى لا بدمنه و من اللباس للشتاء والصيف بمثل ذالك وبمسكن يكنهم من المطر والصيف والشمس وعيون المارة

ہر شہر کے مالداروں پر یہ فرض ہے کہ اپنے شہر کے فقراء کی ضرورتوں کو پورا کریں اگر زکواۃ اور مسلمانوں کے دیگر ذرائع سے ان کی ضرورتیں پوری نہ ہوں تو بادشاہ ان کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ ہر آدمی کو ضرورت کے مطابق خوراک، سردی گرمی کے مطابق لباس اور بارش اور گرمی سردی سے بچنے کے لئے مکان مہیا کریں۔

اگر کسی وقت صحیح اقتصادی نظام قائم ہوا اور اس نے "مملکت پاکستان" کے تمام باشندوں کی کفالت عامہ کے پروگرام کو اپنا مشن بنایا تو اس کے لئے قاضی صاحب کے ان مذکورہ فتاویٰ میں بھرپور رہنمائی موجود ہے۔

عَنْ عُثْمَانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ